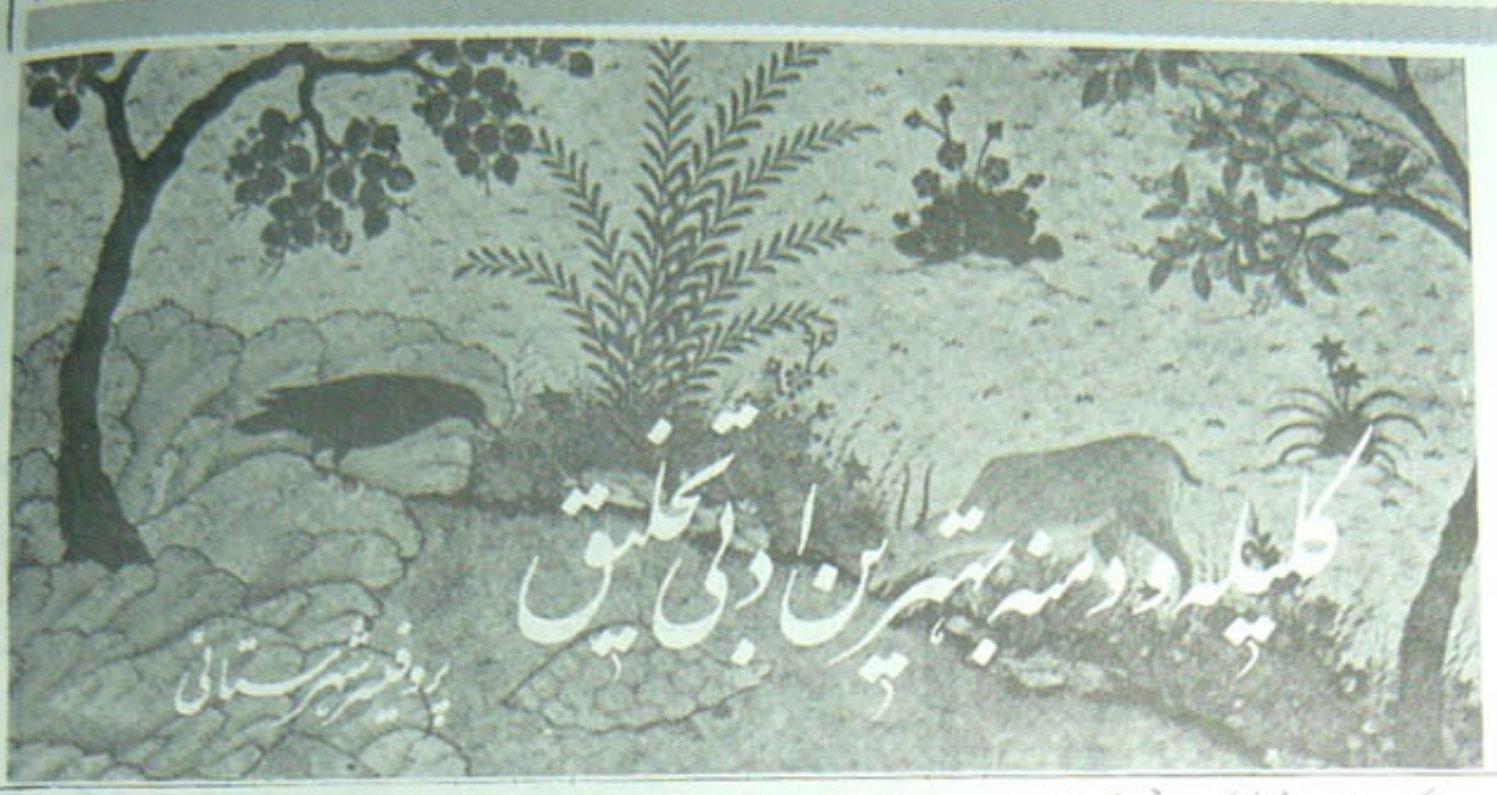

کلیلہ ودمنہ بہترین ادبی تخلیق

پروفیسر شہرستانی

کلیلہ ودمنہ وہ ادبی شاہکار ہے جس کا مطالعہ تقریباً دو ہزار سال سے مسلسل کیا جا رہا ہے۔ اور اہل دانش و بینش نیز سیاحان فکر و نظر اس سے برابر مستفید ہوتے رہے ہیں۔ بعض دانشوروں نے تو اس کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ کتاب دراصل دیوتاؤں کا صحیفہ ہے۔ کیونکہ اس میں گونا گوں انسانی فطرت کی عکاسی حیوانات اور پرندوں کے کرداروں کے ذریعہ کی گئی ہے کیونکہ سنسکرت زبان کے دانشور اس رائے کے حامی ہیں کہ انسانوں اور حیوانوں کی زندگی میں باہمی ربط ہے۔ چنانچہ اپنشدوں میں انسانی زندگی کے مختلف پہلو پیش کرنے کے لئے حیوانات کی جبلت کو بطور تمثیل بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس کی مثال ہمیں شاہنامہ فردوسی میں سیمرغ اور زال کی داستان سے بھی ملتی ہے۔

ابن ندیم نے اپنی تالیف "الفہرست" میں لکھا ہے کہ اہل فارس نے سب سے پہلے داستان نویسی شروع کی اور کتاب "ہزار ویک داستان" اس کی بہترین مثال ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مرحوم نے لکھا ہے: "حیوانات کی کہانیاں تمثیلات کی کتابوں میں دو طرح سے آئی ہیں۔ ان میں سے ایک جگہ تو جانور ہی مرکزی کردار ادا کرتا ہے اور دوسری صورت میں حیوان کا کردار رمز و کنایہ میں پیش کیا جاتا ہے۔

کلیلہ اور دمنہ دراصل دو کردار ہیں جنہیں دو گیدڑوں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کلیلہ ہے جو نہایت ہی چالاک و شاطر ہے اور دوسرا بہت ہی دور اندیش (دمنہ) اور اسی بنا پر اپنے مقصد میں کامیاب۔ سنسکرت میں ان کا تلفظ "کریٹک" اور "دمنک" ہے۔ مگر پہلوی زبان میں یہ الفاظ "کلیلک" اور "دمنک" کی صورت میں داخل ہوئے۔ بعد میں یہی لفظ تراش و خراش کے بعد کلیلہ ودمنہ کی صورت اختیار کر کے سریانی زبان میں اس وقت داخل ہوئے جب کہ اس کتاب کا ترجمہ اس زبان میں کیا گیا۔ ۵۷۰ء میں بودھ نامی بھکشو نے اس پہلوی ترجمہ کو جو برزویہ نامی دانشور وزیر نے سنسکرت سے پہلوی میں کیا تھا سریانی زبان میں منتقل کیا۔ اس کے بعد ۱۴۵ھ (۷۵۹ء) میں ابن عبداللہ مقفع نے منصور دوانیقی کی فرمائش پر اس کا ترجمہ فصیح و بلیغ عربی نثر میں کیا جو خوش قسمتی سے ابھی تک محفوظ ہے۔

اصل کتاب سنسکرت زبان میں ودیاپتی نے لکھی تھی جن کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ اس شخص کا نام تھا یا لقب مگر یہ امر مسلم ہے کہ وہ ویدوں کا عالم تھا۔ کتاب کی تالیف کا زمانہ گپت خاندان کا عہد حکومت (تین سو سال قبل مسیح) بتایا جاتا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب سنسکرت کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ کتاب کا مواد پنچ تنتر کی کہانیوں اور مہابھارت کے افسانوی و نیم تاریخی واقعات سے ماخوذ ہے۔ پنچ تنتر میں جو کہانیاں درج ہیں انہیں وشنو شرما نے اسی سال کی عمر میں مرتب کیا۔

بعض دانشمندوں کی یہ بھی رائے ہے کہ کلیلہ ودمنہ کا اصل ماخذ تنتر گیانکا نامی کتاب ہے۔ یہ پند آموز کہانیوں پر مشتمل کتاب، کشمیر میں دو سو سال قبل مسیح، سہر در سم الخط میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب کا

ایک قلمی نسخہ شہر پونہ میں واقع دکن کالج کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ دانشمند وزیر بروزیہ نے پہلوی زبان میں ترجمہ کتاب کے اسی نسخے سے کیا تھا۔ اور ابن مقفع کے عربی ترجمے سے اس کا ترجمہ دیگر زبانوں میں ہوا۔ پندرہ سال کے عرصے میں (۱۲۶۳ء سے ۱۲۷۸ء) جان ڈی کاپو نے اسے لاطینی زبان میں منتقل کیا۔ ۱۰۸۰ء سے کچھ قبل یا بعد اس کا ترجمہ یونانی زبان میں ہوا۔ یونانی زبان کے نسخے سے اس کا ترجمہ (۱۶۶۶ء سے ۱۶۹۷ء کے دوران) پوسین نے اطالوی زبان میں کیا۔ اور اسی ترجمہ کی بنیاد پر یورپ کی دیگر زبانوں میں اس کتاب کا ترجمہ کیا گیا۔

ڈاکٹر برنیر فرانسیسی باشندہ تھا وہ آٹھ سال بادشاہ اورنگزیب کے دربار میں سرکاری معالج کی حیثیت سے مقیم رہا۔ ۱۶۹۹ء میں جب وہ ہندستان سے واپس فرانس گیا تو اپنے ساتھ بہت سی قیمتی کتابوں کا ذخیرہ بھی لے گیا۔ جن میں یہ کتاب بھی شامل تھی۔

میڈم دولہ سیبلر اپنے عہد کی معزز خاتون تھیں۔ ۱۶۷۳ء میں ان کی ملاقات لہ فونٹین (۱۶۹۵-۱۶۲۱) شاعر سے فرانس کے کسی مہمانخانے میں ہوئی اور انہوں نے اس کتاب کا ذکر مذکورہ شاعر سے کیا جس کے بارے میں یہ شاعر خود لکھتا ہے کہ: ہندستان کی اس بیش بہا کتاب نے جس کا ترجمہ یورپ کی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے' فرانس کے لوگوں کو اپنا گرویدہ کرلیا۔ ان کی رائے میں یہ کتاب لقمان حکیم کی پند آموز کتاب سے کہیں زیادہ قدیم و قابل قدر ہے۔ اور میری بہت سی نظموں کا سرچشمہ یہی کتاب ہے۔ میں اس سلسلے میں محترمہ دولہ سیبلر کا ممنون و سپاسگزار ہوں۔ فارسی زبان کے عظیم شیریں سخن و خوش بیان شاعر رودکی متوفی (۳۲۹ھ) نے اس کتاب کا منظوم ترجمہ کیا۔ ذیل میں دو شعر ملاحظہ ہوں:

شب زمستان بود کپی سرد یافت
کرمک شبتاب ناگاہی بتافت
کپیان آتش ہمی پنداشتند
پشتہ ہیزم بدو برداشتند

اس کے بعد تقریباً ۵۳۶ھ میں ابوالمعالی نصراللہ بن محمد بن عبدالحمید نے ابن مقفع کے متن کو فارسی نثر میں منتقل کیا۔ جس میں اس نے مشہور شاعروں کے اشعار اور عربی و فارسی کی ضرب الامثال بھی شامل کرلیں۔

مولانا حسین واعظ کاشفی (متوفی ۹۱۰ھ) نے اسی کتاب کو اپنے عہد کی مروجہ زبان میں از سرنو ترتیب دیا جس میں موصوف نے مختلف ذرائع سے حاصل شدہ مزید مضامین و مطالب کا اضافہ کر کے اس کا عنوان "انوار سہیلی" قائم کیا۔

انوار سہیلی کا سترہویں عیسوی میں داؤد سعید اصفہانی نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ جسے ۱۶۴۴ء فرانس کی کتاب فروش کمپنی سائمن پوڑہ نے پیرس سے شائع کیا۔ فارسی زبان کے عظیم محقق و ادیب ڈاکٹر جعفر محجوب (مرحوم) کی اطلاع کے مطابق انوار سہیلی کا ترجمہ گلمین نامی شخص نے فرانسیسی زبان میں کیا ہے۔ جو ۱۶۹۵ء میں پیرس سے شائع ہو چکا ہے۔

مغل بادشاہ جلال الدین اکبر (۹۴۶ھ - ۱۰۱۴ھ)

کے عہد حکومت میں خالق داد عباسی نے پنچ تنتر کے متن کا ترجمہ پنچ اکیانا کے نام سے فارسی میں کیا۔

دربار اکبری کے نامور دانشمند ابوالفضل بن شیخ مبارک نے انوار سہیلی کو عیار دانش کے تحت عنوان سادہ فارسی زبان میں منتقل کرنا شروع کیا اور یہ کام ۹۹۶ھ تک جاری رہا۔ جسے ۱۹۰۲ء میں منشی نولکشور نے لکھنؤ سے سنگی طباعت کے ذریعے شائع کیا عیار دانش کا خلاصہ نگار دانش کے نام سے نظم کیا گیا۔ جس کے منظوم کی تاریخ ذیل میں درج ہے۔

شد این نگار دانش بسی دلکشای دانا
چون خامہ نگارین دل در سواد بستہ
از غیب بہر سال صورت گرفت مصرع
کلک از نگار دانش نقش مراد بستہ

فارسی زبان کے عظیم مثنوی گو شاعر فردوسی (متوفی ۴۱۱ھ یا ۴۱۶ھ) نے بھی ذکر کیا ہے کہ کلیلہ دمنہ کو برزویہ دانشور نے ترجمہ کیا تھا۔

نگہ کن کہ شادان برزین چہ گفت
بدانگہ کہ بگشاد راز نہفت
کہ امروز در دفتر ہندوان
ہمی بنگریدم بروشن روان
نبشتہ چنین شد کہ در کوہ ہند
گیاہست رخشان چو رومی پرند
کہ آن را چو گرد آوری رہنمای
بیامیزد و دانش آرد بجای
چو زو نامہ رفتی بہ شاہ جہان
دری از کلیلہ نبشتی نہان
بدان چارہ تا نامہ ہندوان
فرستاد نزدیک نوشیروان
بگفت آنچہ از رای دید و شنید
بجای گیاہ دانش آمد پدید
بدو گفت شاہ ای پسندیدہ مرد
کلیلہ روان مرا زندہ کرد
کلیلہ بہ تازی شد از پہلوی
بدینسان کہ اکنون ای بشنوی
بہ تازی ہمی بود تا گاہ نصر
بدانگہ شد درجہان شاہ نصر
گرانمایہ بوالفضل دستور اوی
کہ اندر سخن بود گنجور اوی
بفرمود تا پارسی دری
بگفتند و کوتاہ شد داوری

یہ کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ مضامین کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ یہاں ہم اس کے چند موضوعات کا ذیل میں ذکر کریں گے۔

۱۔ اخلاقی مضامین میں دوستی، محبت، اتفاق، ایثار، پاس عہد وفا، وعدے کی پابندی اور آزار رسانی سے گریز جیسے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہی بغض وحسد اور کینہ دشمنی جیسی خرابیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ کوے، ہرن، چوہے اور جال میں پھنسے کبوتروں کے ذریعے اتفاق اور اتحاد کی خوبیوں پر زور دیا گیا ہے کہ اتفاق کی برکت سے ہی انسان کو پریشانی و غم اور قید وبند کی مصیبتوں سے نجات مل سکتی ہے۔ شکاری کی کہانی میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح شکاری نے ہرن کو جال میں پکڑا اور سور نے اُسے اپنے دانتوں سے زخمی کیا۔ جس سے نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ہوا وہوس اور لالچ کے کیا نقصانات ہیں۔ اسی طرح شیر، سانڈ، باز اور سانپ کی کہانی کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ ضرر رسانی کے نتائج کتنے خراب ہوتے ہیں۔ ایک کہانی میں بتایا گیا ہے کہ ایک شخص کس طرح اپنے خیالات میں مگن یہ سوچتا رہا تھا کہ مجھے مزدوری سے جو پیسے ملیں گے ان سے مرغیاں

خریدوں گا' انہیں بیچ کر بکریاں پالوں گا۔ چنانچہ ایک دن مالدار آدمی بن جاؤں گا۔ اس کی کہانی کے ذریعے یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ انسان کو خیالات کی دنیا میں نہیں بلکہ حقیقت کے ساتھ زندہ رہنا چاہئے۔ اسی طرح کوے کی کہانی کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ کس طرح لوگوں کے دلوں میں اپنے بھائی بندوں کے لئے جذبہ ایثار و قربانی ہونا چاہئے۔

۲۔ سیاسی مضامین۔ یہ مضامین شیر اور سانڈ کی گفتگو کے پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس ضمن میں کلیلہ ودمنہ کی گفتگو بھی بلی اور چوہے کی حکایت کے ذیل میں آگئی ہے۔ جن میں سیاسی موضوعات کی دقیق موشگافی کی گئی ہے۔ ان دونوں حیوانوں کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب کے مصنف نے جو بھی بات کہی ہے اس میں منطقی دلائل کو پیش نظر رکھا ہے۔ چنانچہ دونوں ہی جانور اپنے اپنے حق میں مثبت و منفی دلائل پیش کرتے ہیں جن سے اصل معاملے کی صحیح نوعیت واضح و روشن ہو جاتی ہے۔ "ڈھول کی آواز" کے ضمن میں جو کہانی دی گئی ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ حقائق زندگی کا فیصلہ سنی سنائی باتوں پر نہیں کرنا چاہئے بلکہ دانشمندی کا تقاضہ یہ ہی ہے کہ واقعات کو سن لینے کے بعد ان کی تحقیق و جستجو نہایت ضروری ہے۔ اور اسی طرح کوے کی کہانی میں بتایا گیا ہے کہ ایک سانپ کوے کے گھونسلے کے پاس رہتا تھا۔ جس نے موقع پاکر اس کے بچے کو ڈس لیا' جب کوے کو اصلی واقعہ کا علم ہوا تو اس نے سانپ سے اپنے بچے کا انتقام تو لیا مگر بڑی دانشمندی کے ساتھ اس کے ساتھ ماہی خور جانور کی کہانی آئی ہے جس کا یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ کہ ظالم اپنے مظالم کی بنا میں کسی نہ کسی دن گرفتار ہوتا ہے اگلی کہانی شیر اور جنگل کے جانوروں کی ہے۔ یہ جانور شیر کی ہیبت سے ہر وقت خوفزدہ رہتے ہیں اور اسے ہلاک کرنے کی تدبیر سوچتے ہیں۔

مذکورہ کتاب میں اس کے علاوہ بھی بہت سی ایسی کہانیاں آئی ہیں جن میں سیاسی تدابیر کو عملی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے مصنف نے اس رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ سیاست' باہمی معاشرت' دوستی اور دشمنی میں کسی چیز کو استحکام و پائداری حاصل نہیں بلکہ زمانے کے بدلتے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے رخ بھی بدل جاتے ہیں۔

۳۔ فلسفیانہ مضامین۔ اس کتاب میں فلسفیانہ خیالات بھی پنہاں ہیں جنہیں خاص شکل اور مخصوص عبارات میں بیان کیا گیا ہے۔ ان مطالب کو اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے دل میں ان کے خلاف نفرت یا بغاوت کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ مثال کے طور پر تناسخ (آواگون) کے عقیدے کو ہی لے لیجئے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک چوہا مرنے کے بعد ایک لڑکی کی صورت میں جنم لیتا ہے۔ یا بلی مر کر عورت کی شکل میں دوبارہ اس دنیا میں آتی ہے وغیرہ۔ گویا کتاب کے مصنف کا عقیدہ ہے کہ

زندگی کا دور مسلسل چلتا رہتا ہے۔ جو کبھی اور کہیں ختم نہیں ہوتا۔ دراصل یہ عقیدہ ان ہندوؤں کا ہے جو وشنو کو اپنا اوتار مانتے ہیں۔ ویدوں میں بھی اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ جانوروں اور انسانوں کے درمیان ایسا ہی رشتہ ہے جو پڑوسیوں میں ہوتا ہے چنانچہ اس رشتے کو اپنشدوں میں مزید وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

انسانوں کی طرح حیوانات' نباتات اور چرند و پرند میں بھی سمجھنے کی صلاحیت اور بے زبانی کے باوجود زبان ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں تکلیف پہنچانے کو قتل سے منع کیا گیا ہے چنانچہ وہ داستان جس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک گیدڑ اور شیر نے دنیا تیاگ کر پارسائی کی زندگی اختیار کرلی تھی۔ اس میں اس قصہ کی صراحت ہے۔

یونانی فلسفی فیثا غورث حضرت عیسیٰ کی ولادت سے چھ صدی پیشتر گزرا ہے۔ نظریہ تناسخ (آواگون) اس کے فلسفیانہ افکار میں بھی موجود ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ یہ باز جو آج کسی شکاری کے ہاتھ پر بیٹھا ہوا ہے یہ شاید کل تر و تازہ جنگلوں میں شہزادہ رہا ہوگا۔ پنج تنتر کہانیوں میں چوہے اور جوگی کی کہانی میں بھی یہی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ مذہبی افکار: کلیلہ و دمنہ کی کہانیوں میں بہت سے قدیم مذہبی افکار و خیالات کی جھلک بھی ملتی ہے۔ جو جین دھرم سے اس کتاب میں پہنچے ہیں۔ اس سلسلے میں جتنی بھی کہانیاں ملتی ہیں ان میں اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہر فتنہ و فساد کی جڑ عورت کی ذات ہے۔ جین دھرم کا پرچار حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً چھ صدی پہلے مہاویر نے کیا تھا۔ چنانچہ ان کا فلسفہ بھی سنسکرت سے پہلوی' عربی اور دری زبانوں میں منتقل ہوا۔ چنانچہ موچی کی بیوی' بوڑھی عورت' کنیز اور عیاش مرد' بچھو اور اس کی مادہ' کشمیر تاجر کی بیوی اور مصور' بغداد کا سلطان اور اس کی ملکہ' بڑھئی کی بیوی۔ بوڑھی اور مشاطہ جیسی کہانیوں میں جو واقعات درج ہیں وہ

۵۔ اقتصادی مسائل۔ کا ذکر بھی ان کتابوں میں جگہ جگہ ملتا ہے جن کا مطالعہ دقت نظر سے کیا گیا ہے اور ان کا حاصل یہ ہے کہ مال' حلال ذرائع سے حاصل کیا جائے اور اس کا صحیح مصرف ہو۔ مذکورہ کتاب کے مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ جو شخص کام نہیں کرتا ہے بلکہ جمع پونجی پر ہی گذر بسر کرتا ہے وہ اپنی معاشی زندگی کو نہیں سنوار سکتا۔ اگر آدمی اپنے سرمایے کو کاروبار میں نہ لگائے بلکہ اسے گھر بیٹھے ہی کھاتا رہے تو وہ جلد ہی مفلس و قلاش ہو جائے گا۔ اگر اسے فضول خرچ کرے گا تو پشیمان ہوگا۔ اگر صحیح جگہ پر اپنے سرمایے کو نہیں لگائے گا تو وہ اپنے ہاتھوں خود ہی اپنی زندگی برباد کرے گا۔ مال دراصل پانی کے ذخیرے کی مانند ہے۔ اگر پانی اس میں جمع ہوتا رہے اور اس کے نکاس کا کوئی راستہ نہ ہو تو ایک وقت وہ آئے گا کہ پانی کناروں کے باہر نکل جائے گا اور ضائع جائے گا۔

مذکورہ کتاب کے مصنف نے مال و دولت کی حرص کو قابل مذمت قرار دیا ہے۔ اس نے ایک کہانی میں اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بظاہر مادی اشیاء سے آدمی کا دل اتنا قوی رہتا ہے کہ گویا وہ عالم مستی میں سرشار ہو۔ چنانچہ اس کا انداز فکر ہی بدل جاتا ہے۔ اسی ضمن میں اس نے ایک چوہے کی کہانی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کس طرح ایک چوہے نے کسی شخص کے گھر میں بل بنا کر اس میں بہت سے سونے کے سکے جمع کر لئے تھے جنہیں دیکھ کر وہ ہر وقت شاد و خرم نظر آتا لیکن کسی طرح اس کے مالک کو اس کا پتہ چل گیا چنانچہ اس نے اس کا بل کھود کر اس کی ساری رقم اپنے قبضے میں کرلی۔ مال کے تلف ہو جانے سے چوہے کی حالت مردوں سے بھی بدتر ہو گئی۔

۶۔ تدبر و دور اندیشی۔ اس کتاب میں تدبر و دور اندیشی نیز واقعات کے رونما ہونے سے قبل ہی ان کا سدباب کرنے کی جانب خاص توجہ دی گئی ہے۔ چنانچہ اس کے ہر باب میں کوئی نہ کوئی ایسی حکایت ضرور ملتی ہے اور اس سے مصنف کی دقت نظر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جب بھی وہ کسی مسئلے سے دوچار ہوتا ہے تو وہ اس کا حل تلاش کرنے کے لئے منطق و دلیل کا سہارا لیتا ہے اور اس کا حل کرنے کے لئے بہت سی راہوں پر غور و فکر کرتا ہے۔ بالآخر کسی عملی تدبیر سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ خود کتاب کا مصنف بھی ایسا مدبر شخص نظر آتا ہے کہ جو حسن تدبر سے مسئلے کا حل نکال سکتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں کوؤں کے وزیر اور بندروں کی فوج' شکاری کے جال سے کبوتروں کی نجات' نیز اس چوہے کی کہانی سے ملتی ہے جو تین طرف سے بلی نیولے اور الو کے نرغے میں پھنس گیا تھا مگر حسن تدبیر کے باعث اس نے اپنی جان بچائی۔

مذکورہ کتاب کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ اسے از سر نو مرتب کیا جائے۔ اور جس طرح طٰہٰ حسین مرحوم نے ہزار و یک داستان نامی کتاب کا مختلف زاویوں سے تجزیہ کیا ہے اس کا بھی اسی طرح تجزیہ و مطالعہ کیا جانا چاہئے۔